تحقیق

حکیم محمود احمد ظفر

مغربی تہذیب کی ترقی۔

مغربی تہذیب کے دو پہلو ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس کا چہرہ اتنا ہی بھیانک ہے کہ:

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

یہ تہذیب خالص سیکولر ہے اور اس کا سب سے بڑا مقصد زر پرستی اور دولت اکٹھا کرنا ہے۔ مشرکین عرب کے بارہ میں قرآن کہتا ہے کہ "وہ خطرہ اور مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں" لیکن یورپ کے مادہ پرست مادیت میں اس قدر منہمک ہیں اور ان کی زندگی میں خدا تعالیٰ سے اتنا استغنا اور دلوں میں اتنی سختی اور بے حسی پیدا ہو گئی ہے اور وہ زر پرستی کے جنون میں خدا فراموشی اور خود فراموشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز امریکی اخبار نویس جان گنتھر نے اپنی کتاب (Inside Europe) میں اس زر پرستی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"انگریز ہفتہ میں چھ روز پرستش بنک آف انگلینڈ میں کرتا رہتا ہے۔ صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے۔"

اسی طرح ایک اور مصنف پروفیسر جوڈ (JAOD) نے انگلستان اور یورپ کی زر پرستی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصول دولت کی خواہش گزشتہ دو سو سال سے دیگر جملہ محرکات عمل سے زیادہ کام کرتی رہی ہے کیونکہ دولت حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور شان و عظمت ہی سے انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ سیاسیات، ادب، سینما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال اپنے پڑھنے سننے والوں کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں جذبہ حصول دولت انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہو۔

"یہ دولت پرستی ہمارے مذہبی عقائد سے متصادم ہے کیونکہ مذہب یقین دلاتا ہے کہ غریبی اچھی اور دولت مندی بری ہی نہیں بلکہ دولت مند کو نیک بننے کا اتنا ہی کم امکان ہے جتنا کہ غریب کو زیادہ ہے۔ اگر چہ تقاضائے دانش و تعلیم مذہب متفقہ طور پر یہی سکھاتے ہیں کہ خدا پرستی اور حصول جنت غریبی کے ساتھ ہیں۔ تاہم لوگوں نے تعلیم مذہب کو سچا سمجھ کر اس پر عامل ہونے کا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا۔ اور موجودہ

حصول دولت کو مستقل حصول راحت آسمانی پر بخوشی ترجیح دیتے رہے ہیں۔ غالباً ان کا یہ خیال رہا ہے کہ

بستر مرگ پر توبہ کر کے وہ آخرت میں اتنا ہی فائدہ حاصل کر سکیں گے جتنا کہ یہاں اس دنیا کی مخزونہ دولت سے۔ ان کے اس نظریہ کو (SAMJLE BUTLER) نے اپنی کتابوں میں یوں ظاہر کیا ہے کہ بے شمار مصنفین لکھتے ہیں کہ ہم خدا اور دولت کی ساتھ ساتھ پرستش نہیں کر سکتے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بات آسان نہیں لیکن قابل حصول چیزیں آسان ہوتی ہی کب ہیں؟

"ہمارے اصول کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہم ہٹلر کے پکے مقلد ہیں۔ ہم دولت کے اتنے ہی دلدادہ ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد کہ دولت ہی فرد و سلطنت کی عظمت کا باعث ہوتی ہے۔ اس قدر واضح ہے کہ اس سے دنیا کے دو محرک اصول قائم کئے گئے ہیں جو کہ اعلیٰ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک عدم مداخلت کا معاشی اصول ہے۔ جو کہ انیسویں صدی میں غالب رہا۔ اس اصول کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پر منحصر رکھتا ہے۔ گویا ان کا مذہب لذتیت ہے کہ عمل کا محرک لذت جذبات دلی نہیں بلکہ لذت تقاضائے دولت ہے۔

"دوسرا اصول جو کہ بیسویں صدی میں غالب نظر آتا ہے۔ مارکس (MARX) کا اصول معاشی تقدیر و تنظیم ہے۔ یہ اصول بتلاتا ہے کہ انسان کا معاشی نظام ہمیشہ اس کی مالی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہی نظام ان کے ادب۔ اخلاقیات، مذہب، منطق نیز نظام حکومت کا خالق ہوتا ہے۔ ان دونوں اصولوں کی مقبولیت کا انحصار اسی قدر و منزلت پر ہے جو کہ ہمارے مرد و عورت نمایاں طور پر دولت کے انفرادی اور سیاسی معیار حسن پر رکھتے ہیں۔ (JAOD: Philosophy for our times, P.146)

اسی مصنف کا یہ فقرہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے جو اس نے اپنی دوسری کتاب میں لکھا ہے کہ:

"جو نظریہ حیات اس زمانہ میں غالب ہے۔ وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے۔"

(JOAD: Guide to Modern Wickedness P.114)

دولت پرستی کا یہ جنون آج ہم پر بھی سوار ہے اور ہم بھی اسی رو میں بہ رہے ہیں۔ جس میں یورپ کا خدا ناآشنا معاشرہ بہ رہا ہے۔ ہمارا قبلہ مقصود بھی آج زر اندوزی ہے خواہ بڑے سے بڑا جرم کر کے حاصل ہو۔ اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ اور دینی حدود کو پھلانگ کر ہیروئین اور دوسری منشیات کا کاروبار کیا جا رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے پاکستان کی نوجوان نسل کو منشیات کا عادی بنایا جا رہا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کی جا سکے۔

موجودہ مغربی تہذیب نے علم و صنعت اور اخلاق و انسانیت کے درمیان ایک عظیم خلیج پیدا کر دی

ہے۔ اس کی وجہ سے موجودہ تہذیب اپنا مقصد پورا کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب نے ہمیں مہذب بنانے کے بجائے ذہنی اور اخلاقی طور پر ہمیں دیوالیہ بنا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی دانشور ڈاکٹر الیکسس کرل (Alexis Carrel) اپنی مشہور کتاب (Man the Unknown) میں لکھتا ہے۔

''موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جن میں فنی تخلیق، ذکاوت اور جرات ہو۔ ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے، ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط نظر آتا ہے۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے ان سے وابستہ کی تھیں اور وہ ان لوگوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرات کے مالک ہوں اور تہذیب کو اس دشوار گزار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جا سکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ افراد انسانی نے اس تیزی کے ساتھ ترقی نہیں کی جس تیزی کے ساتھ ان اداروں (INSTITUTIONS) نے ترقی کی ہے جو انسانی دماغ کا نتیجہ ہیں۔ یہ دراصل سیاسی راہ نماؤں کے ذہنی اور اخلاقی نقائص کا نتیجہ ہے۔ اور ان کی اس جہالت کا جس نے موجودہ اقوام کو خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ طبعی علوم اور صنعتی فنون نے انسان کے لئے جو ماحول تیار کیا ہے وہ انسان کے مناسب حال نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ برجستہ ہے، کسی سابق نقشہ یا غور و فکر پر مبنی نہیں، اور اس میں انسان کی شخصیت کے ساتھ مطابقت، لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ ماحول جو محض ہماری ذہانت اور ایجادات کی تخلیق ہے، ہمارے قدوقامت اور ہماری صورت کے مطابق نہیں ہے۔ ہم خوش نہیں ہیں۔ ہم ایک روز افزوں اخلاقی اور عقلی انحطاط میں مبتلا ہیں۔ جن قوموں میں صنعتی تمدن پھلا پھولا اور اپنے عروج کو پہنچا وہ پہلے سے بہت کمزور ہیں۔ اور وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ وحشت و بربریت کی طرف بڑھ رہی ہیں لیکن ان کو اس کا احساس نہیں۔ ان کو اس وقت اس باغی دشمن انسانیت ماحول سے کوئی قوت بچا نہیں سکتی جو طبعی علوم نے ان کے گرد حصار کی طرح کھینچ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری تہذیب نے پچھلی تہذیبوں کی طرح زندگی کے لئے ایسی شرطیں عائد کر دی ہیں جو (بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر) زندگی کو ناممکن العمل بنا دیں گی۔ ہم مادیت کا جتنا علم رکھتے ہیں اس کے مقابلہ میں زندگی کا علم اور یہ کہ انسان کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیئے، بہت کم رکھتے ہیں اور ہمارا علم اس

بارہ میں ابھی تک بہت پیچھے ہے، اور اس کم علمی کا نقصان ہم بھگت رہے ہیں۔

''ایجادات و اکتشافات میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ طبیعی علوم، فلکیات اور علم الکیمیا کے اکتشافات کو زیادہ اہمیت دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ راحت، تعیش، جمال، جسامت اور تکلفات زندگی میں اضافہ اور ترقی سے کیا فائدہ، جب ہمارا ضعف اس سے فائدہ نہ اٹھانے دے اور ہم اس کو صحیح راستہ پر نہ لگا سکیں۔ ایسے نظام زندگی کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے سے کیا فائدہ جس سے اخلاقی پہلو بالکل خارج کر دیا جائے اور عظیم قوموں کی بہترین صفات نکال دی جائیں۔ ہمارے لئے مناسب بات یہ تھی کہ تیز رفتار جہازوں، زیادہ آرام، موٹروں، زیادہ اوزاروں ریڈیو اور زیادہ عمدہ رصد گاہوں کے بجائے اپنے آپ کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ میکانکی، طبیعی اور کیمیاوی علوم کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو ذہانت بخش دیں اور اخلاقی نظام، اعصابی توازن اور امن و سکون عطاء کریں۔''

اسی طرح ایک اور مغربی مفکر اور دانشور نے اس بارہ میں نہایت اچھی گفتگو کی ہے کہ علوم طبعی نے ہمیں وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی، لیکن ہم اس کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں۔ یورپ کی نشأت جدیدہ کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کرتے رہے، لیکن اسی سرعت بلکہ اس سے بھی زیادہ سرعت سے دین و اخلاق میں تنزل و انحطاط واقع ہوتا رہا۔ انہی حالات میں ایک ایسی نسل نے جنم لیا جس کے ترازو کا ایک پلڑا تو آسمان سے باتیں کرتا ہے اور دوسرا پلڑا تحت الثریٰ میں ہے۔ یہ نسل ایک طرف اپنے صنعتی کمالات اور اپنے خوارق عادات کے لحاظ سے نیز مادہ اور طبعی قوتوں کی تسخیر میں مافوق البشر معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف اپنے اخلاق و اعمال اپنے حرص و طمع، سنگ دلی، بے راہ روی، کمینہ پن، فحاشی اور برہنگی میں چوپایوں اور درندوں سے بھی بدتر ہے۔ اس کے پاس زندگی کے تو تمام وسائل ہیں لیکن اس کو جینا نہیں آتا۔ اس کی علمی اور صنعتی بلند پروازیوں اور اخلاقی پستیوں میں قطعاً کوئی تناسب نہیں ہے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ (JAOD) لکھتا ہے کہ

''ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے۔ اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا یہ حال ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں۔ سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سنا کرتے ہیں۔ بچے ٹیلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ برقی تصویریں آنے لگیں۔ بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں۔ بغیر کسی درد اور تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں۔ کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں۔ ربڑ کی سڑکیں بنتی ہیں۔ ایکسرے کے ذریعے ہم اپنے جسم کے اندرونی حصہ کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ تصویریں بولتی اور گاتی ہیں۔ لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا

پتہ چلایا جاتا ہے۔ برقی لہروں سے بالوں میں پیچ و خم ڈالے جاتے ہیں۔ آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر جاتے ہیں، لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنادیں جس میں غریبوں کے بچے آرام اور حفاظت کے ساتھ کھیلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

"ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے PENDIN SANDS میں تین یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یا کسی ہوا باز نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں بیس گھنٹہ میں یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی۔ جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا

"ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں پرندوں کی طرح اڑتے اور سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو، لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔"

JAOD: Guide to Modern Wickedness, P.146

کتنا اچھا تجزیہ کیا ہے اس ہندوستانی فلسفی نے!

یہ ایجادات اور انکشافات جو جدید سائنس نے دنیا کو دیئے، ان کے موجدین نے تو انہیں انسانیت کی بہتری کے لئے ایجاد کیا تھا، لیکن اب اس کا استعمال انسانیت کی تباہی اور بربادی کے لئے ہو رہا ہے۔ تلوار ایک چور کے ہاتھ میں انسان کو قتل اور لوٹنے کے کام میں آتی ہے لیکن ایک مجاہد کے ہاتھ میں وہی تلوار اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس میں تلوار کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی برائی ہے۔ قصور اور برائی اس ہاتھ میں ہے جو اس کو استعمال کرتا ہے۔

موجودہ ترقی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک حرف میں اس کا تجزیہ ہے "سرعت" یعنی ہر کام میں سرعت اور جلدی۔ موجودہ ایجادات اور اختراعات نے ہر شعبہ زندگی میں سرعت پیدا کر دی۔ اب ان ایجادات سے سرعت اور تیز رفتاری پیدا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا۔ پہلے ڈاک گھوڑوں پر جاتی تھی۔ پھر اس میں تیز رفتاری پیدا ہوئی تو موٹروں پر جانے لگی پھر اور سرعت اور تیز رفتاری پیدا ہوئی تو پسنجر ٹرین پر جانے لگی۔ پھر اور سرعت اور رفتار کی تیزی کے لئے میل ٹرین کو استعمال کیا جانے لگا۔ پھر اور سرعت اور تیز رفتاری درکار ہوئی تو ہوائی جہاز پر ڈاک پہنچنے لگی۔ اب ہوائی جہازوں کی رفتار میں تیزی پیدا کی جانے لگی۔ اور معلوم نہیں کہ یہ تیزی کہاں تک پہنچے، کیونکہ FAX کی ایجاد تو تیز رفتاری اور سرعت کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی ہے۔ چنانچہ پہلے لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ "تمدن نام ہے راحت کا" لیکن موجودہ معاشرہ میں "تمدن نام ہے سرعت کا" سرعت موجودہ زمانہ کے نوجوان کا دیوتا ہے۔ اس کے آستانہ پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھاتا ہے۔ اب ایک مغربی

نقاد اور دانشور کے قلم سے سنئے کہ اس نے اس بارہ میں کیا لکھا ہے۔

"بلاشبہ ہم بڑی سرعت اور تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لئے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھچ گئی ہیں۔ قومیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئی ہیں اور ان کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے آپس کے تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار اور ناشگفتہ ہیں۔ وہ وسائل جن سے ہم اپنے ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہو جاتے ہیں، انہوں نے الٹا دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ ہم نے آواز پہنچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باتیں کیں، لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کی پوری طاقت کے ساتھ اپنی ہمسایہ قوم کو چھیڑنے اور دق کرنے کا کام لے رہی ہے۔ وہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ وہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل اور معتقد بنا دے۔

"ہوائی جہاز کو دیکھو جو فضائے آسمانی میں منڈلا رہا ہے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ اس کے موجد اپنے علم و مہارت اور صنعت کے لحاظ سے مافوق البشر ہستیاں تھیں اور جنہوں نے اس پر پہلے پہلے پرواز کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بلند ہمتی عزم اور جرات بڑی قابل داد اور لائق تحسین ہے۔ لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لیں جن کے ماتحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہوئے اور مستقبل میں بھی استعمال ہوں گے۔ وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری، انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھوٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیسوں کا پھینکنا اور ان کمزوروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا جن کے پاس اس مصیبت سے حفاظت کا کوئی سامان نہیں۔ یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں یا شیاطین کے۔

"دیکھنا یہ ہے کہ مورخ اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتا ہے کہ ہم دھاتوں اور سونے کو کس طرح استعمال کرتے تھے۔ وہ لکھے گا کہ ہم نے ایسی ترقی کر لی تھی کہ لاسلکی (WIRELESS) کے ذریعہ سونے کی اطلاعات دے سکیں۔ وہ ایسی تصویریں پیش کرے گا جو دکھائی دیں گی کہ بینک کے لوگ کس صفائی اور مشاقی کے ساتھ سونے کا وزن اور شمار کرتے تھے۔ وہ اس خارق عادت طریقہ کا ذکر کرے گا جس سے ہم روزانہ سونے کو ایک دارالسلطنت سے دوسرے دارالسلطنت کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کشش اجسام کے قانون کو توڑتے تھے۔ وہ قلم بند کرے گا کہ یہ نیم وحشی صنعتوں میں بڑے ماہر اور جری تھے، لیکن اس بین الاقوامی تعاون میں ناکام تھے جو سونے پر کنٹرول رکھے اور اس کو صحیح طور پر تقسیم کرے۔ ان کو صرف اتنی فکر تھی کہ وہ قیمتی دھاتوں کو امکانی سرعت کے ساتھ دفن کر دیں۔ وہ سونے اور دھاتوں کو افریقہ میں زمین کے شکم سے بڑی مہارت کے ساتھ نکالتے تھے، اور لندن نیویارک اور پیرس کے محافظ خانوں میں دفن کرتے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۳۸ پر دیکھیں)